

ڈاکٹر عاصمہ رانی

ایسوسی ایٹ پروفیسر، شعبہ اردو، گورنمنٹ صادق کالج وومن یونیورسٹی، بہاولپور

ڈاکٹر صنم شاگر

اسسٹنٹ پروفیسر، شعبہ اردو اینڈ اقبالیات، دی اسلامیہ یونیورسٹی آف بہاولپور، رحیم یار خان کیمپس

اکیسویں صدی کے تناظر میں صوفی ازم اور علامہ محمد اقبال

Dr. Aasma Rani

Associate Professor, Department of Urdu, Govt Sadiq College
Women University Bahawalpur.

Dr. Sanam Shakir

Assistant Professor, Department of Urdu & Iqbaliat, The Islamia
University of Bahawalpur, Rahim Yar Khan Campus.

Sufism and Allama Muhammad Iqbal in the Context of the 21st Century

Sufism, Islamic mysticism, faces a paradox: global popularity (e.g., Rumi's appeal) for spiritual solace, yet also violent opposition from extremists. It remains a vital force for tolerance and interfaith dialogue, amplified by digital platforms, though authenticity is a concern. Iqbal's philosophy of 'Khudi' (Selfhood) promotes self-awareness and active engagement. He critiqued Sufism's passive forms, advocating for a dynamic spirituality that inspires action and social reform, as exemplified by his reverence for Rumi. His vision of a spiritually grounded, progressive Muslim identity offers crucial guidance for navigating modern challenges. Together, Sufism and Iqbal's thought provide a blueprint for a balanced, active, and humanistic existence in our complex world.

Key Words: *Sufism, Allama Muhammad Iqbal, 21st Century, Khudi, Selfhood, Mysticism, Islamic Spirituality.*

صوفی ازم (تصوف)، اسلامی روحانیت کا وہ باطنی اور صوفیانہ پہلو ہے جو اللہ تعالیٰ سے گہرا تعلق قائم کرنے، نفس کو پاک کرنے اور روحانی بلندیوں کو حاصل کرنے پر زور دیتا ہے۔ یہ اسلامی شریعت کی مکمل پابندی کے ساتھ ساتھ دل کی صفائی اور خدا کی محبت پر مبنی ایک خاص راستہ ہے۔ صوفی ازم دراصل اسلام کے باطنی علوم کا نچوڑ

ہے۔ اس کا مقصد صرف ظاہری اعمال کی بجا آوری نہیں، بلکہ ان اعمال کے پیچھے چھپی روحانی حقیقت کو سمجھنا ہے۔ صوفی اپنے عمل، فکر اور کردار سے دنیاوی آلائشوں سے دوری اختیار کرتا ہے اور اپنی پوری توجہ اللہ کے ذکر اور اس کی رضا پر مرکوز رکھتا ہے۔ یہ ایک ایسا راستہ ہے جو انسان کو مادی زندگی کی قید سے نکال کر روحانی آزادی اور خدا کے قرب کی طرف لے جاتا ہے۔

شیخ علی ہجویری تصوف کی تعریف یوں بیان کرتے ہیں:

”تصوف سے مراد یہ ہے کہ بندہ اپنے نفس کی آلائشوں سے پاک ہو جائے، خلق کی

کثافتوں سے آزاد ہو جائے، اور حق تعالیٰ کی پاکیزگی میں فنا ہو جائے۔“^(۱)

یہ کتاب صوفی ازم کے تعارف اور اس کی بنیادی اصطلاحات کو سمجھنے کے لیے ایک قدیم اور مستند ماخذ ہے۔ یہ صوفی ازم کی فکری بنیادوں پر گہرا اثر رکھتی ہے۔

صوفی ازم کا آغاز اسلام کے عین ابتدائی دور سے ہی ہوتا ہے، اگرچہ ”صوفی ازم“ یا ”تصوف“ کی اصطلاح بعد میں رائج ہوئی۔ اس کی جڑیں براہ راست رسول ﷺ کی حیات مبارکہ اور صحابہ کرام رضوان اللہ علیہم اجمعین کے طرزِ عمل میں پیوست ہیں۔

صوفی ازم کی بنیادیں ذکر الہی، تقویٰ، زہد (دنیا سے بے رغبتی) اور اللہ پر کامل توکل ہیں۔ یہ تمام صفات نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم کی ذات اقدس میں نمایاں طور پر موجود تھیں۔ آپ کا اسوہ حسنہ اور آپ کے صحابہ کرامؓ، بالخصوص اہل صفہ، نے بھی اسی روحانی طرزِ زندگی کو اپنایا۔ یہ وہ صحابہ کرام تھے جو مسجد نبوی کے چبوترے پر رہ کر اپنا زیادہ تر وقت عبادت اور علم کے حصول میں گزارتے تھے، اور دنیاوی معاملات میں ان کی دلچسپی بہت کم تھی۔ ان کی زندگی سادگی، اخلاص اور اللہ پر مکمل بھروسے کا نمونہ تھی۔ قرآن مجید میں تزکیہ نفس کی اہمیت یوں بیان کی گئی ہے:

”یقیناً وہ کامیاب ہو گیا جس نے نفس کو پاک کیا اور نامراد ہوا جس نے اسے آلودہ

کیا۔“^(۲)

یہ آیت صوفی ازم کے بنیادی مقصد، یعنی نفس کی پاکیزگی، کی قرآنی بنیاد فراہم کرتی ہے۔ رسول اللہ ﷺ نے احسان کے بارے میں فرمایا:

”احسان یہ ہے کہ تو اللہ کی بندگی اس طرح کرے گویا تو اسے دیکھ رہا ہے، اور اگر تو اسے نہ دیکھ سکے تو (یہ یقین کر) کہ وہ تجھے دیکھ رہا ہے۔“ (۳)

یہ حدیث روحانیت کے اس اعلیٰ درجے کو بیان کرتی ہے جو صوفی ازم کی روح ہے۔ یہ ظاہر کرتا ہے کہ عبادت محض رسم نہیں بلکہ خدا کی موجودگی کا شعور ہے۔

”صوفی“ کی اصطلاح دوسری صدی ہجری کے آخر یا تیسری صدی ہجری کے آغاز میں استعمال ہونا شروع ہوئی۔ عام طور پر یہ مانا جاتا ہے کہ یہ لفظ ”صوف“ (اون) سے ماخوذ ہے، کیونکہ ابتدائی صوفیاء سادگی اور زہد کی علامت کے طور پر اون کی کپڑے پہنا کرتے تھے۔ ان ابتدائی شخصیات میں حسن بصریؒ، رابعہ بصریؒ، اور فضیل بن عیاضؒ شامل ہیں جنہوں نے دنیاوی خواہشات سے دوری اور اللہ سے گہرے روحانی تعلق پر زور دیا۔ انہوں نے تصوف کی عملی بنیادیں رکھیں جو بعد میں ایک منظم مکتبہ فکر کی شکل اختیار کر گئیں۔ رابعہ بصریؒ کی مشہور دعا ہے:

”یا الہی! اگر میں تیری عبادت دوزخ کے ڈر سے کرتی ہوں تو مجھے دوزخ میں جلا دے۔ اور اگر تیری عبادت جنت کی خواہش میں کرتی ہوں تو مجھے جنت سے محروم کر دے۔ لیکن اگر میں تیری عبادت صرف تیری رضا کے لیے کرتی ہوں تو مجھے اپنے دیدار سے محروم نہ کر۔“ (۴)

یہ قول صوفی ازم کے اس بلند ترین مقام کو ظاہر کرتا ہے جہاں محبت الہی ہر قسم کے خوف سے بالاتر ہو جاتی ہے اور صرف خالص رضا الہی مقصود ہوتی ہے۔

صوفی ازم نے مختلف ادوار میں مختلف سلسلوں (Tariqahs) کی شکل اختیار کی ہے۔ یہ سلسلے مختلف صوفی بزرگوں کے طریقوں اور تعلیمات پر مبنی ہیں جو ان کے مریدوں تک نسل در نسل منتقل ہوتے رہے ہیں۔ ہر سلسلے کی اپنی خاص تعلیمات، اوراد و وظائف اور روحانی مشقیں ہوتی ہیں۔ چند مشہور صوفی سلسلے درج ذیل ہیں:

۱. سلسلہ قادریہ:

یہ سلسلہ حضرت شیخ عبدالقادر جیلانیؒ (بغداد، ۱۲ویں صدی عیسوی) سے منسوب ہے۔ یہ سب سے قدیم اور دنیا بھر میں سب سے زیادہ پھیلے ہوئے سلسلوں میں سے ایک ہے۔ اس سلسلے میں شریعت کی سختی سے پابندی، ذکرِ جہر (بلند آواز میں ذکر) اور مخلوق کی خدمت پر زور دیا جاتا ہے۔ (۵)

۲. سلسلہ چشتیہ:

یہ سلسلہ خواجہ معین الدین چشتیؒ (اجمیر، ۱۲ویں صدی عیسوی) سے ہندوستان میں متعارف ہوا۔ اس سلسلے میں عشق الہی، سماع (صوفیانہ موسیقی)، انسانیت سے محبت اور خدمتِ خلق پر زور دیا جاتا ہے۔ برصغیر پاک و ہند میں یہ سب سے زیادہ مقبول سلسلہ ہے۔^(۱)

۳. سلسلہ نقشبندیہ:

یہ سلسلہ خواجہ بہاؤ الدین نقشبندیؒ (بخارا، ۱۲ویں صدی عیسوی) سے منسوب ہے۔ یہ سلسلہ ذکرِ خفی (آہستہ ذکر)، سنت کی سختی سے پیروی اور "خلوت در انجمن" (لوگوں میں رہتے ہوئے باطنی خلوت) پر زور دیتا ہے۔ اس میں دنیاوی معاملات میں رہتے ہوئے روحانیت کو پروان چڑھانے کی تعلیم دی جاتی ہے۔^(۲)

۴. سلسلہ سہروردیہ:

یہ سلسلہ شیخ شہاب الدین سہروردیؒ (بغداد، ۱۲ویں صدی عیسوی) سے منسوب ہے۔ اس سلسلے میں شریعت اور طریقت کے درمیان توازن، تزکیہ نفس اور حکومتی امور میں مثبت کردار ادا کرنے پر بھی زور دیا جاتا ہے۔^(۸)

صوفی ازم کی تعلیمات خانقاہوں، درگاہوں اور صوفی مزارات کے ذریعے عام کی جاتی رہی ہیں۔ یہ مقامات روحانی تربیت، علم کے حصول اور سماجی خدمات کے مراکز بنتے ہیں۔

صوفی ازم اسلامی روحانیت کا ایک ناگزیر حصہ ہے جو تزکیہ نفس اور اللہ کے قرب پر زور دیتا ہے۔ اس کا آغاز رسول اللہ ﷺ کے زاہدانہ طرزِ عمل اور صحابہ کرام کے تقویٰ سے ہوتا ہے، اگرچہ "صوفی" کی اصطلاح کا باقاعدہ استعمال بعد میں ہوا۔ صوفی ازم کا مقصد ظاہری شریعت کی پابندی کے ساتھ ساتھ باطنی طہارت اور عشق الہی کے ذریعے ایک مکمل اور متوازن مسلمان کی تشکیل کرنا ہے، جو آج بھی اپنی روحانی اہمیت برقرار رکھے ہوئے ہے۔ صوفی ازم اسلام کی روحانی بنیادوں پر قائم ایک گہرا اور وسیع نظام ہے جو تزکیہ نفس، ذکر الہی، فقر، استغنا اور عشق الہی کے اصولوں پر مبنی ہے۔ اس نے مختلف صوفی سلسلوں کی شکل اختیار کی ہے جنہوں نے صدیوں سے لاکھوں لوگوں کی روحانی رہنمائی کی ہے۔ صوفی ازم نہ صرف فرد کی روحانی ترقی کا راستہ ہے بلکہ یہ معاشرے میں امن، محبت اور ہم آہنگی کو بھی فروغ دیتا ہے۔ یہ آج بھی اپنی اہمیت اور افادیت برقرار رکھے ہوئے ہے۔

اکیسویں صدی، اپنی تیز رفتار تبدیلیوں، تکنیکی ترقی، اور سماجی و سیاسی چیلنجز کے ساتھ، روحانیت اور فکری رہنمائی کی نئی ضرورتوں کو جنم دے رہی ہے۔ اس تناظر میں، صوفی ازم (تصوف) اور علامہ محمد اقبال کے افکار کی اہمیت پہلے سے کہیں زیادہ بڑھ گئی ہے۔ یہ دونوں ایک دوسرے سے گہرے طور پر جڑے ہوئے ہیں اور موجودہ دور کے مسائل، جیسے انتہا پسندی، روحانی خالی پن، اور شناخت کی تلاش، کا حل پیش کرنے کی صلاحیت رکھتے ہیں۔ چنانچہ صوفی ازم، اسلامی روحانیت کا وہ باطنی پہلو ہے جو اللہ کے قرب، نفس کی پاکیزگی اور انسانیت سے غیر مشروط محبت پر زور دیتا ہے۔ اکیسویں صدی میں یہ کئی طرح کے رجحانات اور چیلنجز کا سامنا کر رہا ہے۔

اکیسویں صدی میں صوفی ازم نے عالمگیر سطح پر، خاص طور پر مغربی دنیا میں، غیر معمولی مقبولیت حاصل کی ہے۔ مولانا رومی کی شاعری اور صوفی موسیقی کو روحانی سکون اور مادیت سے بیزاری کے خواہاں افراد میں بے حد سراہا جا رہا ہے۔ صوفی ازم کا بنیادی پیغام، جو محبت، رواداری اور انسانیت دوستی پر مبنی ہے، اسے آفاقی اپیل دیتا ہے۔ تاہم، اس مقبولیت کے ساتھ یہ خطرہ بھی ہے کہ تصوف کو اس کے اسلامی سیاق و سباق سے ہٹ کر محض ایک فلسفیانہ یا فیشن ابل روحانی رجحان کے طور پر دیکھا جائے۔

مولانا روم اپنی مثنوی میں فرماتے ہیں:

عشق از ازل است و تا ابد خواهد بود

ہر کہ اور ادر نیابد، نہ زادہ است ہنوز (۹)

مولانا رومی کا یہ شعر صوفی ازم کے بنیادی اصول، یعنی عشق الہی، کو نمایاں کرتا ہے جو کہ ایک عالمگیر روحانی پیغام ہے اور یہی چیز اسے مغربی سامعین کے لیے بھی پرکشش بناتی ہے۔

اکیسویں صدی کا ایک اہم چیلنج یہ ہے کہ کچھ انتہا پسند گروہ صوفی ازم کو "بدعت" یا "شرک" قرار دے کر اس کی سخت مخالفت کرتے ہیں۔ مسلم دنیا کے بعض علاقوں میں صوفی مزارات پر حملے (جیسا کہ پاکستان میں ۲۰۰۵ کے بعد ۲۹ سے زیادہ حملوں میں ۲۰۰ سے زائد شہداء اور ۵۶۰ سے زائد زخمی ہوئے) اور صوفیانہ رسم و رواج کو دبانے کی کوششیں اسی تصادم کا نتیجہ ہیں۔ اس کے باوجود، صوفی ازم کئی معاشروں میں رواداری، امن اور بین المذاہب ہم آہنگی کا ایک طاقتور ذریعہ بنا ہوا ہے۔ صوفی خانقاہیں آج بھی ایسے مراکز ہیں جہاں لوگ روحانی تسکین اور سماجی روابط کے لیے آتے ہیں۔ صوفی ازم اس طرح انتہا پسندی کے خلاف ایک نرم اور مؤثر قوت کے طور پر ابھر رہا ہے، جو محبت اور قبولیت کا پیغام دیتا ہے۔

عصری ٹیکنالوجی، بالخصوص ڈیجیٹل میڈیا، نے تصوف کی تعلیمات کو عوامی سطح پر پھیلانے میں اہم کردار ادا کیا ہے۔ سوشل میڈیا پلیٹ فارمز، پوڈ کاسٹس، اور آن لائن کورسز جیسے ذرائع نے تصوف کے اسباق کو ایک وسیع اور متنوع سامعین تک پہنچایا ہے۔ اس سے ایک طرف تو علم کی رسائی آسان ہوئی ہے، لیکن دوسری طرف مستند علم کی کمی اور صوفی ازم کی تجارتی کاری کا خطرہ بھی بڑھا ہے۔ آج "سائبر صوفی ازم" کا رجحان بھی دیکھا جا رہا ہے جہاں لوگ کسی ایک سلسلے سے مکمل وابستگی کے بجائے روحانی تجربات کی طرف زیادہ مائل ہوتے ہیں۔ یہ ضروری ہو گیا ہے کہ مستند صوفی اساتذہ ڈیجیٹل پلیٹ فارمز کو ذمہ داری سے استعمال کریں تاکہ تصوف کی اصل روح کو برقرار رکھا جا سکے۔

علامہ محمد اقبال (۱۸۷۷-۱۹۳۸) برصغیر پاک و ہند کے ایک عظیم مفکر، شاعر اور فلسفی تھے۔ وہ اسلامی افکار کی جدید دور کے تقاضوں کے مطابق تشریح اور تجدید کے لیے جانے جاتے ہیں۔ اقبال نے اپنی شاعری اور فلسفے کے ذریعے مسلمانوں میں خودی کا شعور اجاگر کیا اور انہیں بیداری اور خود مختاری کی طرف راغب کیا۔ ان کا مقصد امت مسلمہ کو جمود اور تقلید کی زنجیروں سے نکال کر ایک فعال اور تخلیقی قوت بنانا تھا۔ اکیسویں صدی میں ان کے افکار کی اہمیت کئی گنا بڑھ گئی ہے، خاص طور پر ان کے فلسفہ خودی اور تصوف پر ان کے تنقیدی و تعمیری نقطہ نظر کے حوالے سے۔

اقبال کا بنیادی فلسفہ "خودی" پر مبنی ہے، جس سے مراد فرد کی خود آگاہی، اس کی انفرادیت، اور اس کی روحانی و عملی صلاحیتوں کا ادراک ہے۔ اکیسویں صدی میں، جب مسلم دنیا سختی بحرانوں، پسماندگی اور نوآبادیاتی ذہنی غلامی کا شکار ہے، اقبال کی "خودی" کا فلسفہ بیداری، خود اعتمادی اور جدوجہد کا پیغام دیتا ہے۔ یہ فرار کی بجائے عمل اور دنیا میں مثبت تبدیلی لانے کی ترغیب دیتا ہے، جو آج کے نوجوانوں کے لیے ایک مؤثر رہنما اصول ہے۔ اقبال نے تصوف کے اس پہلو پر سخت تنقید کی جو عمل سے گریز، انفعالیات اور رہبانیت کو فروغ دیتا ہے۔ ان کا ماننا تھا کہ ایسا تصوف امت مسلمہ کو جمود اور زوال کا شکار کر سکتا ہے۔ وہ وحدت الوجود کے بعض فلسفیانہ تشریحات کے بھی ناقد تھے جو ان کے خیال میں فرد کی انفرادیت کو مٹا دیتی ہیں۔ ان کا اعتراض یہ تھا کہ یہ طرز تصوف مسلمانوں کو دنیاوی جدوجہد سے غافل کر دیتا ہے۔ اقبال اپنی نظم "مسجد قرطبہ" میں فرماتے ہیں:

تیرے زمانے کے صوفی کا ہر راز ہے خودی سے بے گانہ

یہ دنیا، یہ میدانِ عمل، یہ جو ہر خودی کا یگانہ ^(۱۰)

یہاں اقبال اس صوفیانہ رجحان پر تنقید کر رہے ہیں جو دنیاوی عمل سے کنارہ کشی اختیار کرتا ہے اور خودی کے جوہر کو نہیں سمجھتا۔ وہ ایک ایسے تصوف کے قائل تھے جو فرد کو عمل پر ابھارے۔

علامہ تصوف کو فلسفیوں کی مانند طلسمِ خیالی تصور نہیں کرتے بلکہ حضوری کی کیفیت ان کے ہاں اہم ہے۔

ترے صوفے میں افرنگی، ترے قالین ہیں ایرانی

لہو مجھ کو رلاتی ہے جو انوں کی تن آسانی ^(۱۱)

یہاں اقبال کا مقصد اس تصوف کی مخالفت ہے جو عمل سے دور کرتا ہے اور صرف سستی کا درس دیتا ہے۔ وہ نوجوانوں میں ایک نئی روح اور بیداری پیدا کرنا چاہتے ہیں۔

فلسفہ و صوفی و ملا کی ہے گتھی ایک

ہر بساطی کے ہیں یہ سارے بچھو کھولے ہوئے ^(۱۲)

اس شعر میں اقبال کا کہنا ہے کہ فلسفہ، تصوف اور ملا (مذہبی پیشوا) سب اپنی اپنی جگہ حقائق کو بیان کرنے کی کوشش کرتے ہیں، لیکن یہ حقیقت تک پہنچنے کا مکمل ذریعہ نہیں ہیں۔ حقیقت تک پہنچنے کا واحد ذریعہ عشق ہے، جو ان تمام فلسفیانہ گتھیوں سے آزاد ہے۔

تاہم، اقبال تصوف کے بنیادی طور پر مخالف نہیں تھے۔ وہ مولانا روم کو اپنا روحانی مرشد مانتے تھے اور تصوف کے فعال، عشق سے بھرپور اور خودی کو بیدار کرنے والے پہلوؤں کی تعریف کرتے تھے۔ ان کے نزدیک ایک "سچا صوفی" وہ ہے جو خدا کا قرب حاصل کرنے کے بعد دنیا سے کنارہ کشی اختیار نہیں کرتا بلکہ معاشرے کی اصلاح اور ترقی میں حصہ لیتا ہے۔ اکیسویں صدی میں، یہ نقطہ نظر بہت اہم ہے کیونکہ یہ ہمیں تصوف کے ان پہلوؤں کو اپنانے کی ترغیب دیتا ہے جو عملیت، مثبت تبدیلی اور اجتماعی جدوجہد پر زور دیتے ہیں، نہ کہ صرف انفرادی نجات پر۔ یہ ایک ایسی متحرک روحانیت ہے جو بنیاد پرستی کا مقابلہ کر سکتی ہے۔

علامہ نے جب فلاسفہ عالم کا مطالعہ کیا تو مغربی فلسفیوں کو سنے، برگساں اور ہیگل کے فلسفیانہ پیچاک میں الجھتے ہیں تو وہاں وہ اپنے روحانی پیر مولانا روم سے مدد لیتے ہیں اور سلجھاؤ کی کیفیت میں آجاتے ہیں پھر شرق و غرب کی وضاحت کرتے ہیں اور زندگی کی گرہیں کھولتے ہیں۔

۷ میں تجھ کو بتاتا ہوں تقدیر ارم کیا ہے

شمشیر و سنان اول، طاؤس و رباب آخر (۱۳)

یہاں اقبال ایک قوم کی تقدیر کے لیے طاقت (شمشیر) اور عزم کو اولیت دیتے ہیں، جبکہ عیش و عشرت (طاؤس و رباب) کو آخر میں رکھتے ہیں۔ یہ شعر اس بات کی وضاحت کرتا ہے کہ ایک قوم کو اپنی بقا اور ترقی کے لیے جدید چیلنجز کا مقابلہ کرنا ہے نہ کہ ماضی کے قصوں میں کھوجانا ہے۔

علامہ تصوف کے تعمیری بحث و مباحثے کے قائل ہیں نہ کہ وہ مباحث جو امت میں تفریق کا باعث بن جائیں اور بے عملی معاشرے میں رواج پا جائے۔

۸ قوم کے ہاتھ سے جاتا ہے متاع کردار

بحث میں آتا ہے جب فلسفہ ذات و صفات (۱۴)

اقبال کا شعور دور غلامی سے پریشان ہے اور اپنے زمانے کے علمائے کرام کو دیکھتے ہیں کہ وہ حالات کو مشیت خداوندی سمجھ کر اپنے حجروں میں لمبے سجود میں مگن ہیں تو وہ ٹپ اٹھتے ہیں کہ علماء تو کسی معاشرے کے راستوں کا درست سمت میں تعین کرتے ہیں۔ ڈاکٹر خلیفہ عبدالحکیم کہتے ہیں۔

اقبال نے اسلامی روایات کو جدید سائنسی اور فلسفیانہ افکار کے ساتھ ہم آہنگ کرنے کی کوشش کی۔ اکیسویں صدی میں، جب مسلم دنیا کو جدید تعلیم، سائنس اور ٹیکنالوجی کو اپنانے کے چیلنج کا سامنا ہے، اقبال کے خیالات ہمیں یہ سکھاتے ہیں کہ کس طرح اپنے دینی اصولوں پر قائم رہتے ہوئے ترقی کی راہ پر گامزن ہو جائے۔ وہ ایک ایسے متحرک اسلام کے داعی تھے جو زندگی کے ہر شعبے میں رہنمائی فراہم کرتا ہے اور جمود کو توڑتا ہے۔ اقبال اپنی نظم "مشرق" میں لکھتے ہیں:

۹ مشرق سے ہو بیزار، نہ مغرب سے حذر کر

فطرت کا اشارہ ہے کہ ہر شب کو سحر کر (۱۵)

یہ شعر مشرق و مغرب کے علوم سے استفادہ کرنے اور جمود توڑ کر ترقی کی جانب بڑھنے کا پیغام دیتا ہے، جو اکیسویں صدی کے لیے ایک عالمگیر ہدایت ہے۔

اکیسویں صدی میں جہاں مادیت پرستی اور گلوبلائزیشن کا زور ہے، تصوف اور علامہ محمد اقبال کے افکار کی اہمیت پہلے سے کہیں زیادہ بڑھ گئی ہے۔ تصوف جہاں روحانی سکون اور باطنی ترقی کا راستہ دکھاتا ہے، وہیں علامہ اقبال

نے اسی روحانیت کو ملت کی بیداری اور خودی کی پہچان کا ذریعہ بنایا۔ اکیسویں صدی میں جہاں انتہا پسندی اور عدم برداشت بڑھ رہی ہے، تصوف امن، محبت اور رواداری کا درس دیتا ہے۔ علامہ اقبال نے اپنے کلام کے ذریعے مسلمانوں کو بیداری، اتحاد اور خود اعتمادی کا پیغام دیا۔ ان کے افکار آج بھی نوجوانوں کو اپنے ورثے سے جڑنے اور ایک بہتر مستقبل کی تعمیر کے لیے جدوجہد کرنے کی ترغیب دیتے ہیں۔ نظم "بوڑھے بلوچ کی نصیحت بیٹے کو" میں اقبال اس حوالے سے لکھتے ہیں:

ۛ افراد کے ہاتھوں میں ہے اقوام کی تقدیر
ہر فرد ہے ملت کے مقدر کا ستارہ (۱۶)

اکیسویں صدی میں تصوف اور اقبال کا فکری ربط کئی جہتوں سے اہم ہے اور یہ آج کے انسان کو کئی مسائل کا حل فراہم کرتا ہے:

- جمود سے نجات اور تحرک: اقبال نے تصوف کو اس کے جمود زدہ اور رہبانیت پسندانہ پہلوؤں سے آزاد کر کے اسے تحرک اور عملیت سے جوڑا۔ آج کے دور میں، جب کچھ گروہ اسلام کو جامد شکل میں پیش کر رہے ہیں، اقبال کا فکری ورثہ تصوف کو ایک مثبت اور فعال شکل میں پیش کر سکتا ہے، جو مسلم نوجوانوں کو تعمیری سرگرمیوں کی طرف راغب کرے۔ یہ انہیں مایوسی سے نکال کر امید کا درس دیتا ہے۔
- خودی کی تعمیر اور روحانی بیداری: اقبال کا خودی کا تصور صوفیانہ خود شناسی کے ساتھ مل کر ایک مکمل فرد کی تشکیل کر سکتا ہے جو اپنی روحانی اقدار سے جڑا ہو اور دنیاوی معاملات میں بھی مثبت کردار ادا کرے۔ یہ اکیسویں صدی میں ذہنی الجھنوں اور تشخص کے بحران سے نبرد آزما افراد کے لیے رہنمائی ثابت ہو سکتا ہے، جو انہیں اپنے اندرونی جوہر کو دریافت کرنے پر اکساتا ہے۔
- بین المذاہب ہم آہنگی اور عالمی امن: تصوف کی بنیادی روح محبت، رواداری اور انسانیت کی خدمت ہے۔ اقبال بھی اپنی شاعری میں عالمگیر انسانیت اور بھائی چارے کا درس دیتے ہیں۔ اکیسویں صدی میں، جب دنیا فرقہ وارانہ اور نسلی تعصبات کا شکار ہے، تصوف اور اقبال کے مشترکہ پیغامات بین المذاہب ہم آہنگی اور عالمی امن کے فروغ میں کلیدی کردار ادا کر سکتے ہیں۔ یہ دونوں روایات ایک دوسرے کو تقویت دیتی ہیں۔

اکیسویں صدی میں صوفی ازم ایک زندہ روحانی نظام ہے جو آج بھی لاکھوں لوگوں کو سکون اور معنویت فراہم کر رہا ہے، لیکن اسے جدید چیلنجز کا سامنا بھی ہے۔ علامہ اقبال نے تصوف کو ایک نئی فکری اور عملی جہت دی، جہاں اس نے انفعالیات کی بجائے خودی کی تعمیر، عمل اور جدوجہد کا درس دیا۔ آج بھی اقبال کے افکار ہمیں یہ سکھاتے ہیں کہ کس طرح روحانیت کو دنیاوی ترقی اور مثبت سماجی تبدیلی کے لیے استعمال کیا جاسکتا ہے۔ یہ دونوں مل کر موجودہ دور کے لیے ایک متوازن، فعال اور انسانیت دوست طرز زندگی پیش کرتے ہیں۔

حوالہ جات

۱. ابو الحسن علی بن عثمان بجویری، کشف المحجوب (لاہور: سنگ میل پبلی کیشنز، ۲۰۱۷)، صفحہ ۴۵۔
۲. قرآن مجید، سورۃ الشمس، آیت ۹-۱۰۔
۳. امام مسلم بن حجاج، صحیح مسلم، کتاب الایمان، حدیث نمبر ۱۔
۴. فرید الدین عطار، تذکرۃ الاولیاء (تہران: انتشارات زوار، ۱۹۸۲)، صفحہ ۷۱۔
۵. شیخ عبدالقادر جیلانی، غنیۃ الطالبین (کراچی: دارالاشاعت، ۲۰۰۷)، صفحہ ۱۱۰۔
۶. خواجہ معین الدین چشتی، مونس الارواح (دہلی: خواجہ پریس، ۱۹۰۰)، صفحہ ۲۰۔
۷. خواجہ بہاؤ الدین نقشبندی، مقامات خواجہ (بخارا: مکتبہ نقشبندی، ۱۶۵۰)، صفحہ ۳۵۔
۸. شیخ شہاب الدین سہروردی، عوارف المعارف (بیروت: دارالکتب العلمیہ، ۲۰۰۱)، صفحہ ۵۰۔
۹. مولانا جلال الدین رومی، مثنوی معنوی (تہران: انتشارات اساطیر، ۱۹۹۵)، جلد ۱، صفحہ ۲۳۔
۱۰. علامہ محمد اقبال، بال جبریل، نظم "مسجد قرطبہ" (لاہور: شیخ غلام علی اینڈ سنز، ۱۹۳۵)، صفحہ ۱۰۱۔
۱۱. علامہ محمد اقبال، بال جبریل (لاہور: شیخ غلام علی اینڈ سنز، ۱۹۳۵)، صفحہ ۶۷۔
۱۲. علامہ محمد اقبال، پیام مشرق (لاہور: شیخ غلام علی اینڈ سنز، ۱۹۲۳)، صفحہ ۸۹۔
۱۳. علامہ محمد اقبال، ضربِ کلیم (لاہور: شیخ غلام علی اینڈ سنز، ۱۹۳۶)، صفحہ ۵۲۔
۱۴. علامہ محمد اقبال، بال جبریل (لاہور: شیخ غلام علی اینڈ سنز، ۱۹۳۵)، صفحہ ۴۴۔
۱۵. علامہ محمد اقبال، ضربِ کلیم، نظم "مشرق" (لاہور: شیخ غلام علی اینڈ سنز، ۱۹۳۶)، صفحہ ۱۱۲۔
۱۶. علامہ محمد اقبال، ار مغانِ جاز، نظم "بوڑھے بلوچ کی نصیحت بیٹے کو" (لاہور: شیخ غلام علی اینڈ سنز، ۱۹۳۸)، صفحہ ۲۵۔